KitaabPoint.blogspot.com

# خاموشی

ایم اے راحت

پہلی قسط

سپاہی فتح خان، لال پل پر اپنی ڈیوٹی سرانجام دے رہا تھا۔ یہ ڈیوٹی بڑی سخت تھی۔ تاحدِ نظر بکھری ہوئی ویرانی، پل کے نیچے بہتے ہوئے پانی کا شور، دور دور تک کسی ذی روح کا وجود ناپید تھا۔ اسے پل کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گشت کرنا ہوتا تھا۔ پل اچھا خاصا لمبا اور چوڑا تھا۔ اتنا کہ اس سے بھاری ٹریفک آسانی سے گزر سکتا تھا لیکن یہ علاقہ بہت سنسان تھا اور خاص طور سے یہاں رات کے وقت بالکل ٹریفک نہیں ہوتا تھا کیونکہ اکثر یہاں لوٹ مار کی وارداتیں ہو جاتی تھیں۔

فتح خان واحد سپاہی تھا جس نے کبھی یہاں کی ڈیوٹی پر ناک بھوں نہیں چڑھائی تھی اور خوشی سے اپنی ڈیوٹی سرانجام دیتا تھا ورنہ دوسرے سپاہی خوشی سے یہاں نہیں آتے تھے۔ فتح خان کا مزاج الگ تھا۔ وہ نوکری کو نوکری سمجھتا تھا۔ ساری زندگی سر جھکا کر ہر طرح کی ڈیوٹی سرانجام دی تھی۔ اب تو ریٹائر ہونے میں تھوڑا ہی وقت رہ گیا تھا مگر اسے اس کا بھی انتظار نہیں تھا۔ جو ہونا ہے اپنے وقت پر ہو جائے گا۔

اب تو اسے اس پل سے انسیت ہو گئی تھی کیونکہ یہاں ڈیوٹی دیتے ہوئے طویل عرصہ بیت گیا تھا۔ وہ پل کی ریلنگ سے کمر لگا کر جیب سے سگریٹ کا پیکٹ نکالنے لگا۔ ابھی اس نے سگریٹ سلگائی بھی نہیں تھی کہ پل کے دوسرے سرے پر کار کی روشنیاں چمکیں اور وہ رک کر ادھر دیکھنے لگا۔

پھر رات کے سناٹے میں ایک چیخ ابھری اور سگریٹ اس کے ہونٹوں سے نکل کر نیچے گر گئی۔ چیخ اسی کار سے ابھری تھی۔ آواز نسوانی تھی۔ چیخ دوبارہ سنائی دی اور فتح خان نے جلدی سے گن سنبھال لی اور آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کار کو دیکھنے لگا جس کی رفتار سست تھی اور وہ زگ زیگ چل رہی تھی۔ صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ کار کے اندر جدوجہد جاری ہے۔

کار قریب آ گئی۔ اس کی رفتار اور سست ہو گئی۔ فتح خان سے تھوڑے ہی فاصلے پر اچانک کار کا دروازہ کھلا اور کسی نے چلتی کار سے چھلانگ لگا دی۔

فتح خان بری طرح اچھل پڑا تھا۔ چھلانگ لگانے والا لڑکھڑاتا چلا گیا تھا۔ کار فوراً ہی نہیں رکی، تھوڑا آگے جا کر اس کے بریک چرچرائے۔ پھر وہ ریورس ہونے لگی۔

فتح خان اپنا فرض سرانجام دینے کے لیے تیار ہو گیا۔ اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ کوئی خطرناک کام ہونے والا ہے۔ پھر اس نے کار سے چار افراد کو نیچے اترتے دیکھا۔ جس جگہ وہ کھڑا تھا وہاں سے چند گز کے فاصلے پر الیکٹرک پول تھا جس پر سرکاری لائٹ روشن تھی اور ماحول صاف نظر آ رہا تھا۔ اس نے ان چاروں کو دیکھا جو تیزی سے اس طرف بڑھ رہے تھے جہاں کار سے کودنے والا گرا تھا۔ پھر ان میں سے دو نے جھک کر اس جسم کو اٹھایا۔ تبھی فتح خان کے کانوں میں ایک دلخراش چیخ ابھری۔ ”آہ..... چھوڑ دو..... خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو..... چھوڑ دو.... تمہیں خدا کا واسطہ۔“

فتح خان کے لیے اب برداشت کرنا مشکل تھا۔ چنانچہ وہ اپنی جگہ سے آگے بڑھتا ہوا دھاڑا۔ ”چھوڑ دو اسے، چھوڑ دو اسے، پیچھے ہٹ جاؤ ورنہ ایک ایک کو بھون کر رکھ دوں گا۔“ اس نے گن سیدھی کر کے کہا۔

وہ چاروں چونک پڑے۔ انہوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر فتح خان کو دیکھا۔ اپنے چہروں سے وہ چاروں چھٹے ہوئے غنڈے لگ رہے تھے۔ ایک دراز قامت تو بے حد خوفناک چہرے کا مالک تھا۔ انہیں کسی سپاہی کی یہاں موجودگی کا اندازہ نہیں تھا۔ فتح خان کی گن کی نال اپنی طرف اٹھی دیکھ کر وہ سنبھل گئے۔

لمبے قد والے نے دونوں ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”حوالدار صاحب۔ قریب آ کر دیکھو، معاملہ کیا ہے۔ ہماری پوری بات سن لو۔“

”اوئے تم لڑکی کو چھوڑ کر پیچھے ہٹ جاؤ۔ معاملہ میں بعد میں دیکھوں گا۔ چلو پیچھے ہٹو نہیں تو میں فائر کھول دوں گا۔“

”لو ہم نے چھوڑ دیا۔“ ان دونوں نے لڑکی کو چھوڑ دیا اور وہ زمین پر گر پڑی۔ فتح خان گن سیدھی کیے ان کے قریب پہنچ گیا۔ اس نے لڑکی کو دیکھا جس کا چہرہ خون میں لت پت تھا۔ جسم کے دوسرے حصے بھی کار سے گرنے کی وجہ سے زخمی ہوئے تھے۔ اس کے حلق سے کراہیں نکل رہی تھیں۔

”کون ہے یہ..... اور تم لوگ کون ہو؟“ فتح خان نے پوچھا۔

”حوالدار جی۔ یہ ایک خطرناک لڑکی ہے، دو بندوں کو قتل کر کے بھاگی ہے۔ ہم اسے علاقے کے تھانے لے جا رہے تھے کہ اس نے کار سے چھلانگ لگا دی۔“

”ایں۔“ فتح خان نے دوبارہ لڑکی کو دیکھا۔

”ہاں حوالدار جی۔ آپ ہماری مدد کریں۔ یہ تو اچھا ہوا آپ کی گواہی بھی لگ جائے گی۔“

فتح خان نے کچھ سوچا۔ پھر بولا۔ ”یہ قاتل ہے؟“

”ہاں جی۔ آپ قانون والے ہو جی۔ آپ ہماری مدد کریں۔ ایک قاتلہ کو پولیس کے حوالے کرنا ہم سب کی ذمے داری ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ مگر یہ زخمی ہے۔ پہلے اسے پولیس اسٹیشن لے چلو۔“ فتح خان نے گن نیچے کر لی۔ لیکن یہی غضب ہو گیا۔ اچانک لمبے قد والے نے پوری مہارت سے ایک لات فتح خان کے ہاتھ پر رسید کی اور گن ہاتھوں سے نکل کر دور جا گری۔ اس کے ساتھ ہی اس نے اچھل کر فتح خان کے پیٹ پر دوسری لات ماری اور فتح خان اچھل کر دور جا گرا۔

لمبے قد والے نے کہا۔ ”ماردو اسے، چھٹی کرو۔“

تین آدمی فتح خان کی طرف بڑھے لیکن شدید تکلیف کے باوجود فتح خان پھرتی سے اٹھا۔ ان تینوں نے اس پر جھپٹا مارا تھا لیکن فتح خان کے سامنے ایک ہی راستہ تھا۔ اس نے پل کے کنارے کو پکڑا اور نیچے کود گیا۔ وہ دریا میں جا گرا۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔

تینوں افراد نیچے جھانکنے لگے تو لمبے قد والے نے کہا۔ ”خاک ڈالو، جلدی کرو۔“

اور فتح خان نے دریا میں گر کر خود کو سنبھالا۔ وہ بہترین تیراک تھا۔ چنانچہ اس نے دریا کے بہاؤ پر تیرنا شروع کر دیا اور تھوڑی دور جا کر کنارے کی طرف بڑھا۔ کچھ لمحوں کے بعد وہ کنارے پر تھا۔ زندگی تو بچ گئی تھی لیکن اسے افسوس تھا کہ وہ اپنا فرض پورا ادا نہیں کر سکا۔ جان جاتی تو جاتی لیکن فرض تو پورا ہو جاتا۔

کنارے پر نکل کر اس نے سانس ٹھیک کر کے اوپر دیکھا۔ لیکن اوپر خاموشی طاری تھی۔ وردی پانی سے شرابور تھی۔ جوتوں میں بھی پانی بھرا ہوا تھا لیکن وہ اپنی جگہ سے اٹھ کر آگے بڑھ گیا۔ اس جگہ کے چپے چپے سے واقف تھا۔ چنانچہ ایک جگہ سے اس نے ڈھلان عبور کی اور آخر کار سڑک پر پہنچ گیا۔

سڑک سنسان پڑی تھی۔ کار کا کہیں پتا نہیں تھا۔ فتح خان دوڑتا ہوا اس جگہ تک پہنچا جہاں لڑکی گری تھی لیکن اب وہاں خون کے کچھ دھبوں کے سوا کچھ نہیں تھا۔ البتہ اس کی گن اسی جگہ پڑی ہوئی تھی۔

وہ کچھ دیر سوچتا رہا۔ پھر افسوس بھرے انداز میں گردن جھٹک کر آگے بڑھ گیا۔

☆.....☆.....☆

”سر میں زمان شاہ بول رہا ہوں۔“

”ہاں زمان شاہ، خیریت۔ بولو۔“

”خیریت ہے شاہ جی۔ میں لال پل پر کھڑا ہوں۔ یہاں سپاہی فتح خان کی ڈیوٹی تھی۔ اس جگہ واردات ہوئی ہے۔ واردات کی خبر لے کر فتح خان پیدل چل کر تھانے پہنچا۔ لمبا راستہ تھا۔ موبائل رحیم علی کی نگرانی میں گشت پر تھی۔ رحیم علی پہلے تھانے آیا۔ پھر فتح خان کو لے کر موقع پر گیا۔ اس طرح پوری رات گزر گئی۔ مجھے صبح کو خبر ہوئی، میں یہاں آ گیا ہوں۔“

”واردات کیا ہے؟“ شاہ میر نے پوچھا۔ اور زمان شاہ نے مختصر الفاظ میں اسے فتح خان کی کہانی بتائی۔

”میں آرہا ہوں۔“ شاہ میر نے کہا۔

لال پل پر دور ہی سے پولیس موبائل نظر آ گئی تھی۔ زمان شاہ اور دوسرے لوگ موجود تھے۔ کہانی شاہ میر کے علم میں آ گئی تھی۔ خون کے دھبوں کے ساتھ انسانی بدن کو گھسیٹنے کے نشانات بھی نظر آ رہے تھے۔ شاہ میر نے انہیں دیکھا۔ پھر سیدھا ہوا تھا کہ زمان شاہ بول پڑا۔ ”رحمت خاں اور جمال الدین کو میں نے کال کر لیا ہے، سر دونوں راستے میں ہیں، بائیک پر آ رہے ہیں، فوٹو گرافرز آ چکے ہیں۔“

رحمت خاں اور جمال الدین پولیس کے غوطہ خور تھے۔ اندازہ یہی تھا کہ لڑکی کو ہلاک کر کے اس کی لاش پل سے نیچے پھینک دی گئی ہوگی۔ چنانچہ غوطہ خوروں کو لاش کی تلاش کے لیے طلب کیا گیا تھا۔

غوطہ خوروں نے تھوڑے فاصلے پر دریا میں ابھری چٹانوں کے درمیان پھنسی ہوئی لڑکی کی لاش برآمد کر لی۔ کافی خوش شکل اور نوجوان لڑکی تھی۔ اسے پولیس اسپتال منتقل کیا گیا۔ اس کے پاس سے کوئی ایسی چیز برآمد نہیں ہوئی تھی جو لڑکی کے بارے میں کوئی نشاندہی کرتی۔ لاش کی تصویریں بنائی گئیں اور اخبارات کو دے دی گئیں لیکن دو دن تک لڑکی کے ورثا کا پتا نہیں چل سکا۔ تیسرے دن پولیس اسٹیشن کو ایک فون موصول ہوا۔

”آپ تھانے سے بول رہے ہیں۔“ دوسری طرف سے آواز آئی۔

”جی فرمائیے۔“ شاہ میر نے کہا۔

”انچارج صاحب سے بات کرنی ہے۔“

”میں بول رہا ہوں۔“

”آپ کو ایک انفارمیشن دینا چاہتا ہوں۔“

”جی..... فرمائیں۔“

”اخباروں میں ایک لڑکی کی لاش کی تصویر چھپی ہے۔“

”ہاں۔“ شاہ میر چونک پڑا۔

”اس کے بارے میں کچھ بتانا ہے۔“

”اوہو، بتائیے۔ آپ کون صاحب بول رہے ہیں؟“

”مجھے چھوڑیئے۔ اس کے بارے میں جو کہہ رہا ہوں اسے سنیئے۔ اس کا نام دردانہ ہے۔“

”اور کیا بتا سکتے ہو اس کے بارے میں۔“

”اس کا پتا لکھئے۔ ماں باپ بھی ہیں اس کے۔ بس جی اپنے کیے کا پھل سب کو ضرور ملتا ہے۔ آپ پتا لکھئے۔“

شاہ میر نے جلدی سے کاغذ قلم لے کر اس کا بتایا ہوا پتا لکھا۔ پھر بولا۔ ”آپ نے پولیس کی مدد کی ہے۔ ایک اچھے شہری کے لیے پولیس ہمیشہ اچھی رہتی ہے۔ آپ ہمیں اپنے بارے میں بتائیے۔“

”پورے ہاتھ جوڑ کر معافی چاہتا ہوں سر۔ خدا حافظ۔“ فون بند ہو گیا۔

شاہ میر اس کا نمبر دیکھنے لگا۔ پھر اس نے وہ نمبر بھی کاغذ پر لکھا اور اس کے بعد پتے پر نظر دوڑانے لگا۔ اسی وقت صفورا اندر داخل ہوئی تھی۔ اس نے ایڑیاں بجائیں اور شاہ میر مسکرانے لگا۔ صفورا اسے غور سے دیکھنے لگی۔ ”کیسے ہیں سر؟“

”ٹھیک ہوں۔ آپ نے مجھے بہت غور سے دیکھا مس صفورا۔“

”جی سر... میں آپ کی خصوصی مسکراہٹ کے بارے میں اندازہ لگانے کی کوشش کر رہی تھی۔“

”اچھا مسکراہٹوں میں بھی خصوصیت ہوتی ہے۔“

”بے شمار اقسام ہوتی ہیں مسکراہٹوں کی۔ پیار بھری مسکراہٹ، سیاسی مسکراہٹ، سماجی مسکراہٹ، ڈپلومیٹک مسکراہٹ، شاطرانہ مسکراہٹ اور شیطانی مسکراہٹ وغیرہ۔“

”گڈ... میں اس وقت ایک اور خیال سے مسکرایا تھا۔“

”بتائیے۔“ صفورا اپنی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

”میں سوچ رہا تھا کہ اگر شوہر انسپکٹر ہو اور بیوی سب انسپکٹر، دونوں گھر پر ہوں۔ بیوی شوہر کے لیے صبح کی چائے لائے تو کیا اندر داخل ہو کر وہ شوہر کو سلوٹ کرے گی کیونکہ اس کی تو اسے عادت ہو گی لیکن یہ کام اس کے لیے کتنا مشکل ہو گا کیونکہ اس کے ہاتھوں میں چائے کی ٹرے ہوگی۔“

”وہ انسپکٹر کس کام کا جو ایک عدد نوکرانی کا بندوبست نہ کر سکے جو اس کے لیے چائے اور کھانا وغیرہ لایا کرے۔“

”گویا سب انسپکٹر بیوی اسے سلوٹ کیے بغیر باز نہیں آئے گی یعنی شوہر رومینٹک موڈ میں ہو اور.....“ شاہ میر نے اتنا ہی کہا تھا کہ زمان شاہ نے اندر آ کر ایڑیاں بجائیں۔

”ہاں زمان شاہ صاحب، کیا خبر ہے؟“ شاہ میر نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھ کر پوچھا۔

”جی سر۔ گشت پر نکل رہا ہوں۔ کوئی حکم تو نہیں ہے؟“

”ہم دونوں بھی چل رہے ہیں۔ اس لڑکی کے بارے میں کچھ انفارمیشن ملی ہے۔ ہو سکتا ہے ٹھیک ہو۔“

”لاش کے بارے میں سر۔“

”ہاں ایک پتا ملا ہے، چیک کر لیتے ہیں۔“ شاہ میر نے کہا۔

”ٹھیک ہے سر۔“ زمان شاہ نے کہا اور باہر نکل گیا۔ شاہ میر اب سنجیدہ ہو کر صفورا کو اس فون کال کی تفصیل بتانے لگا۔

پولیس موبائل اس پتے پر پہنچ گئی۔ درمیانے درجے کا علاقہ تھا۔ گلیاں صاف ستھری تھیں۔ پولیس موبائل کو سنسنی خیز نظروں سے دیکھا گیا تھا۔ مطلوبہ گھر کے سامنے موبائل رک گئی۔

ایک کانسٹیبل نے دروازے کی بیل بجائی تو ایک اٹھارہ انیس سال کے لڑکے نے دروازہ کھولا۔ اچھی شکل و صورت کا مالک تھا۔ صاف ستھرے کپڑے پہنے ہوئے تھا۔ اس نے حیرت سے پولیس موبائل کو دیکھا۔

”ریاض احمد یہیں رہتے ہیں۔“ کانسٹیبل نے پوچھا۔

”جی۔ میں ان کا بیٹا ہوں۔ میرا نام ایاز احمد ہے۔“

”انسپکٹر صاحب ریاض احمد سے ملنا چاہتے ہیں۔ انہیں خبر کرو۔“

لڑکا اندر چلا گیا۔ پھر ایک عمر رسیدہ شخص ایک اور نوجوان لڑکے کے ساتھ باہر نکل آیا جس کی عمر پچیس سال کے قریب تھی۔ وہ پریشان نظر آ رہے تھے۔ شاہ میر نے صفورا کو اشارہ کیا اور دونوں موبائل سے نیچے اتر آئے۔

شاہ میر نے پُر رعب لہجے میں کہا۔ ”اندر چلو..... تم سے بات کرنی ہے۔“

ریاض احمد سامنے سے ہٹ گیا اور شاہ میر صفورا کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ اس نے گھر کا جائزہ لیا۔ گھر باہر سے بوسیدہ سا تھا لیکن اندر سے کافی بہتر نظر آ رہا تھا۔ ہر چیز موجود تھی۔ فریج، ڈیپ فریزر، ٹیلی وژن، کمپیوٹر۔ یہ تمام چیزیں اس بات کی نشاندہی کرتی تھیں کہ گھر والے باہر سے بوسیدہ، اندر سے آسودہ ہیں۔ ہر چیز نئی لگ رہی تھی جیسے خوشحالی نئی نئی آئی ہو۔

شاہ میر نے ان چیزوں کا جائزہ لیا۔ پھر ان لوگوں کا۔ ان کے چہروں پر پریشانی صاف جھلک رہی تھی۔ شاہ میر نے نرم لہجے میں کہا۔ ”یہ دونوں بچے آپ کے ہیں۔“

”جی ہاں۔ یہ ایاز احمد ہے اور یہ سجاد احمد۔“

”کتنے بچے ہیں آپ کے؟“

ریاض احمد نے ایک لمحے توقف کیا، پھر تھوک نگل کر بولا۔ ”دو، دو۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں نمی آ گئی۔

”صرف دو؟“ شاہ میر نے پوچھا۔

”جی۔“

”ریاض احمد صاحب، آپ جانتے ہیں پولیس سے جھوٹ بولنے کا کیا نتیجہ ہوتا ہے۔“

”نن نہیں حضور، میرے تین بچے ہیں۔“

”دو یہ اور تیسرا؟“

”ایک لڑکی ہے۔“

”کہاں ہے وہ؟“ شاہ میر نے پوچھا۔

ریاض کچھ دیر خاموش رہا۔ پھر اس کی سسکیاں ابھرنے لگیں۔ اسی وقت اندر سے کسی عورت کے رونے کی آوازیں آنے لگیں اور شاہ میر نے افسردگی سے گردن ہلائی۔ ”ریاض صاحب۔ حقیقت کبھی چھپتی نہیں ہے۔ آپ جانتے ہیں۔“

”خدا مجھے غارت کرے۔ خدا مجھے فنا کر دے۔ بہت مانگی ہے اپنے لیے۔ مجھے تو موت بھی قبول نہیں کرتی۔ کیا کروں؟“ ریاض احمد پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔

”اپنے آپ کو سنبھالیے۔ یہ بات آپ کے علم میں آ چکی ہے۔“ شاہ میر نے بڑے لڑکے سے پوچھا۔

”جی صاحب۔ ہم اخباروں میں دردانہ باجی کی لاش کی تصویریں دیکھ چکے ہیں۔“

”اس کے باوجود تم نے پولیس کو خبر نہیں کی۔ جانتے ہو یہ کتنا بڑا جرم ہے۔ بتاؤ پولیس کو اطلاع کیوں نہیں کی تم نے۔“ شاہ میر کا لہجہ سرد ہو گیا۔ کسی نے کوئی جواب نہیں دیا تو شاہ میر بھڑک اٹھا۔ ”مذاق سمجھ رہے ہو تم لوگ۔ تم تینوں کو تھانے لے جاؤں گا۔ الٹا لٹکا کر ماروں گا اور تمہاری زبانیں کھل جائیں گی۔ سمجھ رہے ہو تم۔“

وہ تینوں سہم گئے۔ ریاض احمد نے سر اٹھا کر کہا۔ ”میں بتاتا ہوں صاحب، سب بتاتا ہوں۔ آپ سن لیجئے، پھر جو آپ کا دل کرے، ہمارے ساتھ کیجئے۔ ہم تو ویسے ہی زندہ درگور ہیں۔“

”بتائیے۔“ شاہ میر بولا۔

”وہ میری بیٹی تھی۔ دردانہ تھا اس کا نام۔ جناب ہمارا گھر اس بدنام معاشرے کی برائیوں کا شکار ہو گیا۔ میں ایک دفتر میں نوکری کرتا تھا۔ معمولی سی زندگی گزر رہی تھی ہماری۔ کچھ نہیں تھا ہمارے پاس بھی، ایک تیرا سارا تھا، بچوں کو تھوڑا بہت پڑھا دیا۔ دردانہ نے انٹر کر لیا تھا۔ بڑے لڑکے نے بی اے کر لیا۔ چھوٹے نے میٹرک کیا۔ دردانہ دونوں بیٹوں سے چھوٹی تھی۔ گھر کے حالات برے سے برے ہوتے چلے گئے تو دردانہ نوکری کی تلاش میں نکلی۔ اسی دوران میری نوکری بھی چھوٹ گئی۔ میرے بیٹے بھی نوکری کی تلاش میں تھے مگر انہیں بھی کوئی نوکری نہیں ملی۔ ہمارے گھر میں فاقے ہونے لگے۔ ہم سخت پریشان تھے۔ دردانہ جنونی فطرت کی تھی۔ جب کچھ کرنے کا فیصلہ کرتی تو اندھی ہو جاتی تھی۔ تھوڑے دن تک وہ ماری ماری پھرتی رہی۔ ہم یہ نہیں چاہتے تھے۔ ہمیں فاقے گوارہ تھے۔ اپنی آبرو گھر سے نکالنا اچھا نہیں لگتا تھا۔ ہم نے اسے بہت منع کیا مگر وہ گھر کی حالت خراب نہیں دیکھ سکتی تھی۔ پھر ایک دن اس نے خوشخبری سنائی کہ اسے نوکری مل گئی ہے۔ اس نے اپنی نوکری کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں بتائی۔ وہ صبح سے شام تک مصروف رہتی تھی۔ پندرہ دن کے بعد وہ ہزاروں روپے لے کر آئی اور ہم دنگ رہ گئے۔ میری بیوی نے اس سے سوال کیا کہ وہ اتنی بڑی رقم کہاں سے لائی ہے تو وہ آگ بگولہ ہو گئی اور غرا کر بولی کہ کسی کو اس سے یہ سوال کرنے کا حق نہیں ہے۔ کسی نے زیادہ بکواس کی تو وہ یہ گھر چھوڑ دے گی۔ بس ہم خاموش ہو گئے۔ کچھ نہ کہہ سکے۔ انسان کب بے غیرت ہو جاتا ہے خود اسے بھی پتا نہیں چلتا۔ بس یہ سمجھ لیں کہ اس کے بعد اس نے اس گھر کا حلیہ بدل دیا۔ اس گھر میں سب کچھ اسی کا لایا ہوا ہے۔ ہم میں سے کسی کو یہ سب کچھ گوارہ نہیں تھا مگر ہم کچھ نہیں کہہ سکتے تھے۔ وہ کبھی کبھی کئی کئی دن تک گھر نہیں آتی تھی۔ ہمارے گھر پر انگلیاں اٹھنے لگیں۔ محلے والے ہمیں طرح طرح کی باتیں سنانے لگے۔ لوگ ہم سے ملنا جلنا ترک کرنے لگے۔ ہماری بے بسی پر کوئی ترس نہیں کھاتا تھا۔ ہماری لڑائیاں ہوتی تھیں تو وہ تلخی سے مسکرا کر کہتی۔

”بتا لیجئے مجھے گھر کی ضرورتیں پوری کر دیجئے، میں گھر سے باہر قدم نہیں رکھوں گی۔ ہم نے اسے خودکشی کی دھمکی بھی دی تو اس نے کہا کہ شوق سے مر جائیے۔ آپ جیسے لوگوں کو زندہ رہنے کا حق نہیں ہے۔ صاحب، اسے کس نے مارا ہم نہیں جانتے لیکن ہمیں گرفتار کر کے پھانسی دے دو۔ ہم سب ہی اس کے قاتل ہیں۔“

کچھ دیر خاموشی کے بعد شاہ میر نے پوچھا۔ ”کیا وہ راتوں کو بھی غائب رہتی تھی؟“

”زیادہ تر۔ ایک بار میرے بیٹے نے مجھے بتایا کہ اس نے دردانہ کو بازار میں دیکھا تھا۔ وہ جینز پہنے ہوئے تھی۔ اس سے پہلے کہ سجاد اس کے پاس جائے اس نے ایک کار کا دروازہ کھولا اور اسے خود چلاتی ہوئی چلی گئی۔“

”کیا اسے ڈرائیونگ آتی تھی؟“

”کہاں صاحب۔ میرے کسی بیٹے تک نے آج تک سائیکل نہیں چلائی۔“

”تم نے اسے ٹھیک سے دیکھا تھا۔ وہی تھی۔“ شاہ میر نے سجاد سے پوچھا۔

”جی صاحب، میں نے پوچھا بھی تھا تو اس نے غصے سے کہا کہ اپنے کام سے کام رکھو۔“

”اس نے انکار نہیں کیا؟“

”وہ ہمیں بالکل اہمیت نہیں دیتی تھی۔ ہم بے غیرت ہو گئے تھے۔ اس کی کمائی جو کھاتے تھے۔ اسے برا کہتے تھے اور اس کی کمائی کھاتے تھے۔“ ریاض احمد نے روتے ہوئے کہا۔

”ہوں..... ہم دردانہ کے سامان کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔“

دردانہ کے سامان کی تلاشی لی گئی۔ لباس، اس کی تعلیمی رپورٹ، میک اپ کا سامان، براؤن رنگ کا ایک لفافہ ان کی توجہ کا خاص مرکز بن گیا۔ اسے کھول کر دیکھا گیا تو اس میں سے کچھ پراسرار کاغذات نکلے۔ ان کاغذات پر بال پوائنٹس سے نقشے بنائے گئے تھے اور ان میں کوئی تحریر نہیں تھی البتہ ایک گروپ فوٹو ان کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ اس تصویر میں کچھ لوگ نظر آ رہے تھے جو شکلوں سے ہی جرائم پیشہ لگتے تھے۔ ان کے ساتھ دردانہ بھی کھڑی تھی اور وہ جینز میں ملبوس تھی۔

”یہ ہے نا آپ کی بیٹی؟“ شاہ میر نے تصویر دکھائی اور وہ پھر رو پڑا۔ ”ہاں یہی ہے۔“

”اور یہ کون لوگ ہیں؟“ ریاض احمد نے ان سے ناواقفیت کا اظہار کیا۔ ”یہ لفافہ میں رکھ رہا ہوں۔ آپ دردانہ کی لاش اسپتال کے سرد خانے سے حاصل کر کے اس کی تدفین کر سکتے ہیں۔“

”ایک عرض کرنا چاہتا ہوں انسپکٹر صاحب۔ خدا کے لیے اس کی موت کے بعد اس کی لاش کی بے حرمتی نہ کرائیں۔ ہم پورے محلے میں بدنام ہو چکے ہیں۔ لوگ اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے۔ اس کی لاش آئے گی تو طرح طرح کی باتیں کی جائیں گی۔ کوئی بھی اس کے جنازے میں شریک نہیں ہوگا اور ہم ذلیل ہوں گے۔“ ”ٹھیک ہے۔ اس کی سرکاری طور پر تدفین کر دی جائے گی۔ اجازت دیجئے۔“

☆.....☆.....☆

ضروری کارروائی عمل میں لائی گئی۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ حاصل ہو چکی تھی جس کی تفصیل یوں تھی کہ لڑکی کو گلا گھونٹ کر قتل کیا گیا تھا۔ اس کے دونوں ٹخنوں کی ہڈیاں توڑ دی گئی تھیں۔ ایک بازو فریکچر تھا جسے بڑی بے رحمی سے توڑا گیا تھا۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ تھی کہ وہ باعصمت تھی۔ اس کی آبروریزی نہیں کی گئی تھی۔

”مائی گاڈ۔“ صفورا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”وہ ایک فاحشہ لڑکی سمجھی جاتی تھی۔ اس کے ماں باپ اور بھائی بھی اسے بدکردار سمجھتے تھے لیکن اس نے اپنے گھر کی بہتری کے لیے اپنی جان دے دی۔“

”وہ فون اس کے کسی پڑوسی کا تھا جس نے تصویر پہچان کر پولیس کو فون کر دیا۔“

شاہ میر کے لیے یہ کیس ایک چیلنج بن گیا تھا۔ دردانہ کا سراغ مل گیا تھا لیکن اس کی ڈیوٹی کس نے لگائی تھی، ایک عصمت مآب لڑکی پر آبرو باختہ ہونے کی تہمت کیسے لگائی گئی۔ اس کے لیے ان کاغذات کو کھنگالا گیا جو اس براؤن لفافے سے حاصل ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک جگہ کے بارے میں اشارہ ملتا تھا جہاں منشیات فروخت ہوتی تھیں۔ غور و خوض کے بعد شاہ میر نے ہوٹل سیزرلا کا فیصلہ کیا۔ وہ سادہ لباس میں سیزرلا پہنچ گیا۔ اس جگہ کے بارے میں یہ جان کر حیرت ہوئی تھی کہ یہاں ہر طرح کی منشیات آرام سے مل جاتی ہیں۔

سیزرلا کے ہال میں لوگوں کی تعداد بہت کم تھی۔ کاؤنٹر پر ایک خطرناک سی شکل کا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ شاہ میر نے چائے منگوائی۔ وہ گہری نظروں سے پورے ماحول کا جائزہ لیتا رہا۔ پھر ہوٹل کا ایک ویٹر اس کے پاس آ گیا۔

”اور چائے صاحب۔“

”نہیں، ضرورت ہوئی تو منگوالوں گا۔“

”آپ کو اٹھنا ہوگا۔ یہاں کسی کو زیادہ دیر تک بیٹھنے کی اجازت نہیں ہے۔ ویسے چاند خاں صاحب آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔ وہ اس ہوٹل کے مالک ہیں۔“

”کہاں ہیں وہ؟ مجھ سے کیوں ملنا چاہتے ہیں۔“

”یہ تو وہی بتائیں گے۔ آپ مہربانی کریں۔ میرے ساتھ چلیں۔“

ہوٹل کے اندرونی حصے کے ایک کمرے میں چاند خاں ملا۔ لمبے قد کا مالک تھا۔ اس کا ایک کان غائب تھا اور اس کا سوراخ بہت بھیانک لگ رہا تھا۔ باقی چہرہ بھی جھلسا ہوا سا تھا۔ اس نے خوش اخلاقی سے شاہ میر کا استقبال کیا اور اسے بیٹھنے کی پیشکش کی۔

شاہ میر اطمینان سے بیٹھ گیا تو اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”کہو چاند ستارے، کیسے آنا ہوا۔ ہمارے لیے کوئی خدمت ہے۔“

”چاند خاں تم ہی ہو۔“

”کہنے میں کیا حرج ہے۔“ وہ مسکرا کر بولا۔

”مجھے بلایا تھا تم نے؟“

”ہاں پہلی بار تم ادھر آئے۔ ویسے تمہارا علاقہ بھی نہیں ہے۔ یہاں کے انچارج شہباز خان ہیں۔“

”اس کا مطلب ہے تم مجھے جانتے ہو۔“

”کچھ کام کرتے ہیں چاند ستارے۔ آپ لوگ ہی تو ہمارے مائی باپ ہو۔ ہماری عزت آبرو آپ ہی کے پیروں تلے ہوتی ہے۔ آپ خوش تو جہاں خوش۔“

”کیا جانتے ہو میرے بارے میں؟“ شاہ میر نے کہا۔

”فائل نکلوائی ہے آپ کی۔ شہر کے چند خطرناک افسروں میں سے ایک۔ یہ آپ کی فائل ہے۔ آپ کے یہاں آنے کے بارے میں خبر ملی تو ہم نے آپ کی فائل نکلوالی۔“ اس نے سامنے رکھی فائل شاہ میر کے سامنے رکھ دی اور شاہ میر دلچسپی سے اس پر جھک گیا۔ اس کے بارے میں پوری تفصیل درج تھی کہ کون کون سے تھانوں میں اس کی تعیناتی رہی، کون کون سے مجرموں کو پکڑ کر سزا دلوائی۔ اس کا پاسپورٹ سائز کا فوٹو بھی تفصیل کے ساتھ موجود تھا۔

”ویری گڈ۔“ اس نے تعریفی لہجے میں کہا۔

”غلط کام ہم غلط طریقے سے کرتے ہیں۔ اسی لیے تو مشکلیں کم ہوتی ہیں۔ چاند ستارے، ہوش میں رہنا ضروری ہے۔ ہم سے آپ کو کوئی شکایت ہوئی ہے تو بتاؤ۔“

”ایک چھوٹا سا کام تم سے ہے چاند خاں۔ کچھ معلومات درکار ہیں۔“

”حاضر ہیں۔ حکم کرو۔“ چاند خاں بولا اور شاہ میر نے وہ تصویر نکال کر اس کے سامنے کر دی۔ ”ان لوگوں کے بارے میں پوری تفصیل چاہتے ہیں۔“

چاند خاں نے تصویر دیکھی اور اس کا رنگ بدلا۔ پھر اس نے کہا۔ ”بہت برے لوگ ہیں۔ ہم تو خود ان سے بچ کر رہتے ہیں۔ یہ نادر شاہ ہے۔“ اس نے ایک تصویر کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”اس لڑکی کے قتل کی تفتیش کر رہے ہو۔ یہ لال پل پر قتل ہوئی تھی۔“

”گڈ۔ کافی معلومات ہیں تمہاری۔“

”آپ کے حکم کی تعمیل کر رہے ہیں۔ اگر آپ انہیں نہیں جانتے تو بتاتے ہیں کہ یہ بہت بڑا گروہ ہے۔ باہر کی دنیا میں اس کا کہاں کہاں تعلق ہے، نہیں معلوم لیکن اندر یہ کافی طاقتور ہے۔ ہر طرح کی مشکلوں سے آسانی سے نمٹ لیتا ہے۔ لڑکی کے بارے میں پتا چلا ہے کہ وہ آؤٹ ہو رہی تھی۔ نادر شاہ نے اس کی چھٹی کر دی۔“

”تمہیں کیسے پتا چلا؟“ شاہ میر کا لہجہ خشک ہو گیا۔

”بندے رکھتے ہیں۔ ہمیں سپلائی انہی سے ملتی ہے اور خبریں بھی سنا دیتے ہیں۔ ویسے چاند ستارے معاف کرنا وقت برا ہے۔ الٹی سیدھی تحقیق کر کے کیس داخل دفتر کر دو۔ بلاوجہ خطرے میں نہ پڑو۔ اس کے لیے ہم تمہاری مدد کر سکتے ہیں۔“

شاہ میر نے گردن جھکا کر کچھ سوچا۔ پھر بولا۔ ”بات تو تمہاری ٹھیک ہے چاند خان مگر تم کس مدد کی بات کرتے ہو۔“

”نادر شاہ تک خبر پہنچ جائے گی کہ ہم اس سے تعاون کرنے والے نہیں ہیں۔“

”ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے۔“ شاہ میر مسکرا کر بولا اور باہر نکل آیا۔

اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ چاند خاں بھی اسی گروہ کا آدمی ہے۔ چاند خاں ان کا مہرہ ہے۔ رہی چاند خاں کی دوسری باتیں تو پولیس جب اپنے فرائض کی بجا آوری کا حلف اٹھاتی ہے تو سب سے پہلے اپنی جان کے نذرانے کا فیصلہ کرتی ہے جو ملک و قوم کی بقا کے لیے ہوتا ہے۔ ان لوگوں کے خلاف کام کرنے کا بڑا مزہ ہوتا ہے جو قانون کو کھلونا سمجھتے ہیں۔

وہ اپنی کار میں بیٹھ کر چل پڑا۔ یہ اندازہ لگانے کے لیے کہ کہیں اس کا تعاقب تو نہیں کیا جا رہا، وہ کار مختلف سڑکوں پر گھماتا رہا۔ لیکن اس دوران اس کا ذہن بے چاری دردانہ کے بارے میں سوچتا رہا تھا۔ وہ آبرو باختہ نہیں تھی لیکن اپنے گھر کی پرورش کے لیے اسے ان برے لوگوں کا ساتھ دینا پڑا تھا۔

شاہ میر کا دل چاہا کہ کہیں بیٹھ کر چائے پیے۔ تھوڑی دور جا کر اس نے ایک ریسٹورنٹ کے سامنے کار روک دی۔ پھر وہ کار کا دروازہ کھول کر نیچے اترنے ہی والا تھا کہ اس کی عقبی سیٹوں کے پاس سے ایک آواز سنائی دی۔ ”اجازت ہو تو میں بھی اتر آؤں۔“

شاہ میر سناٹے میں رہ گیا۔ اس نے کار کی عقبی سیٹوں پر نگاہ ڈالی تو اسے ایک شخص نظر آیا جو سیٹوں کے نیچے سے ابھرا تھا۔ شاہ میر کو پورے سفر کے دوران کار میں کسی کی موجودگی کا شائبہ تک نہیں ہوا تھا۔ اسے یہ بہت عجیب لگا۔ وہ شخص جلی جلی سی شکل کا ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ شاہ میر خود بھی نیچے اتر آیا۔

”سر۔ یہ جو میں نے کیا ٹھیک نہیں لیکن یوں سمجھیں، میں آپ کے قدموں کی دھول ہوں۔“

”کار میں کیسے داخل ہوئے؟“ شاہ میر سانپ کی طرح پھنکارا۔

[illegible]

(جاری ہے)

KitaabPoint.blogspot.com

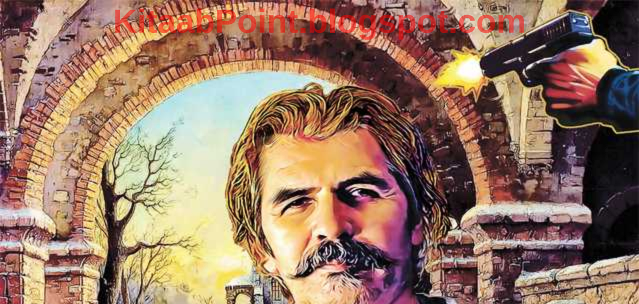

# خاموشی

ایم اے راحت

قسط : 2

[illegible]

(جاری ہے)

KitaabPoint.blogspot.com

KitaabPoint.blogspot.com

# خاموشی

ایم اے راحت

آخری قسط

[illegible]

بند کیں تو فوراً نیند آ گئی۔

جاگا تو شام ہو چکی تھی۔ گھڑی میں وقت دیکھا چھ بجے تھے۔ پورا دن سوتے گزر را تھا۔ کسلمندی سے پڑا رہا۔ اب تک خوب ہنگامے رہے تھے۔ بڑی قتل و غارت گری دیکھی تھی۔ اپنے ہاتھوں سے اس نے ابھی تک کسی کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا، ضرورت ہی نہیں پیش آئی تھی لیکن اب خاصا وقت گزر گیا تھا، کچھ کرنا ہے، کئے بغیر کچھ بھی نہیں سکتا تھا لیکن کیا۔

پرانے کھنڈر کے تہہ خانے سے اسے بہت قیمتی مواد ملا تھا۔ اس کے علاوہ ان فائلوں میں ایسی چیزیں موجود تھیں جن سے نادر شاہ اور اس کا گروہ دردانہ کا قاتل ثابت ہوتا تھا۔ بات صرف نادر شاہ پر ہاتھ ڈالنے کی تھی۔ وہ دارالحکومت جا کر یہ سارا مواد اعلیٰ حکام کو پیش کر کے یہاں تار پور میں آپریشن کرا سکتا تھا لیکن اس کے انجام سے پوری طرح واقف تھا۔

تار پور میں ان لوگوں کی بہت بڑی تعداد موجود تھی، سخت خونریزی ہوتی، زیادہ سے زیادہ ان کے کچھ گودام پولیس کے قبضے میں آ جاتے اور بس۔۔۔۔۔! منشیات کا یہ جال نہ جانے کہاں کہاں پھیلا ہوا تھا۔ پھول گڑھی اس کی ایک مثال تھی، نہ جانے کتنی ایسی پھول گڑھیاں ہوں گی اور نہ جانے انہیں اور کتنے بڑے بڑے لوگوں کی سرپرستی حاصل ہو گی۔

بات دردانہ کے قاتلوں کی تھی۔ ایک بے بس لڑکی جو اپنے گھر کے حالات سے مجبور ہو کر ان لوگوں کے جال میں پھنس گئی تھی، اسے قتل کر دیا گیا تھا اور شاہ میر کو اس کے قاتلوں کا پتا چل گیا تھا۔ مسئلہ یہ تھا کہ اس پر کیسے ہاتھ ڈالا جائے۔

تار پور اب اتنی چھوٹی جگہ بھی نہیں تھی کہ وہاں ایک آدمی بھی پوشیدہ نہ رہ سکے۔ ان لوگوں کا ذہن کہاں کہاں جائے گا۔ یہ جگہ بہترین تھی، اس کے بعد کوئی اور جگہ۔ لیکن کب تک۔۔۔۔۔ نادر شاہ پر کیسے ہاتھ ڈالا جا سکتا ہے۔ روشن خان کا بھی کوئی نشان نہیں ملا تھا۔ بے شک شاہ میر نے اس کی لاش کو قریب سے نہیں دیکھا تھا لیکن جب اس نے اس کی لاش دیکھی تھی تو نادر شاہ جیسا زیرک آدمی بھی وہاں موجود تھا۔ روشن خان نے ان کے بہت سے آدمی ہلاک کئے ہوں گے۔ پھر روشن خان کی لاش کس نے غائب کی، اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔

آسمان پر گہرے بادل چھا گئے جس سے ماحول بہت جلد تاریک ہو گیا۔ دور بس اڈے پر چند دکانوں میں روشنیاں ہو گئی تھیں۔ شاہ میر نے پاس رکھی پانی کی بوتل سے پانی لے کر چہرے پر چھینٹے مارے۔ پھر وہاں سے نیچے اتر آیا۔

بس اڈے پر زیادہ رونق نہیں تھی، سامان بیچنے والے البتہ نظر آ رہے تھے۔ شاہ میر نے موبائل چیک کیا۔ اس نے سوچا تھا کہ زمان شاہ سے پوچھے کہ وہ خیریت سے پہنچ گیا لیکن موبائل کی بیٹری سفید ہو چکی تھی حالانکہ جیکٹ میں چارجر موجود تھا لیکن بیکار تھا۔ وہ بس اڈے کی طرف بڑھ گیا۔

ایک بس روانگی کے لئے تیار تھی۔ کنڈیکٹر آواز لگا رہا تھا۔ ''پھول گڑھی، نصیر آباد، آ جاؤ سواریاں، پھول گڑھی، پھول گڑھی۔''

شاہ میر نے ایک ٹھیلے کے پاس پہنچ کر دال چاول کھائے، پانی پی کر چائے کی تلاش میں نظریں دوڑائیں جو کچھ فاصلے پر نظر آ گئی۔ چائے پیتے ہوئے اس نے سوچا کہ اس کے سامنے دو ٹھکانے ہیں۔ وہ گھر جہاں وہ دو تین بار جا چکا تھا اور جو نادر شاہ کا ٹھکانہ نمبر ایک تھا۔ دوسرا پرانا کھنڈر لیکن پرانا کھنڈر مناسب جگہ تھی، اول تو وہاں چھپنے کا معقول بندوبست تھا، کچن بھی تھا جہاں کھانے پینے کی چیزیں وافر مقدار میں موجود تھیں۔ دوسرے نادر شاہ وہاں زیادہ لوگوں کے ساتھ نہیں ہوتا تھا، کسی بھی وقت اس پر ہاتھ ڈالنے کا موقع مل سکتا تھا۔

پھر ایک اور خیال اس کے ذہن میں آیا۔ اگر نادر شاہ اس کے ہاتھ لگ بھی جائے تو اسے شہر کیسے لے جائے گا۔ اسے پولیس اسٹیشن کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ اس نے ماحول کے مطابق فرض کر لیا تھا کہ یہاں ان لوگوں کا راج ہے اور پولیس ان کا کچھ نہیں بگاڑ پاتی ہو گی۔ اس کا واضح ثبوت یہ تھا کہ ابھی تک اس نے پورے تار پور میں پولیس کا کوئی سپاہی نہیں دیکھا تھا۔ چنانچہ اگر پولیس سے رابطہ کر کے مدد مانگی جائے تو کہیں لینے کے دینے نہ پڑ جائیں۔

اگر دارالحکومت سے پولیس کی نفری منگوائی جائے تب بھی وہ دیکھ چکا تھا کہ نادر شاہ کے پاس کافی لوگ ہیں۔ وہ روپوش بھی ہو سکتا ہے، سارا کھیل بگڑ جائے گا۔ اسے صرف نادر شاہ کو قانون کے حوالے کرنا ہے، شہر لے جانے کے لئے اب اس کے پاس وہ کار بھی نہیں تھی جس کے ذریعے وہ اور روشن خان وہاں آئے تھے۔ وہ کار اس نے نادر شاہ کے کسی ٹھکانے پر بھی نہیں دیکھی تھی۔ لازمی امر ہے کہ اسے پولیس اسٹیشن تک پہنچا دیا گیا ہو گا۔

شاہ میر کے دل میں خیال آیا کہ اسے اس ہوٹل کے پاس دیکھا جائے۔ چنانچہ وہ چل پڑا۔ اب اسے یہاں کے بارے میں معلومات ہو چکی تھی۔ ویسے بھی راستے سنسان ہو گئے تھے۔ چنانچہ وہ ہوٹل کے پاس پہنچ گیا۔ دور سے اس نے وہ جگہ دیکھی جہاں اس کی کار کھڑی ہوئی تھی لیکن اب وہاں کار موجود نہیں تھی۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ اب پولیس کی تحویل میں پہنچ گئی ہو گی۔

دفعتاً ایک اور خیال شاہ میر کے ذہن میں آیا۔ یہ ایک خوفناک خیال تھا۔ نادر شاہ کو اس کے بارے میں تشویش تو ہو گی۔ کار خواہ کہیں بھی ہو، اس کے رجسٹریشن سے وہ شاہ میر کے بارے میں معلومات کر سکتا ہے اور یہ معلوم کرنے کے بعد وہ اسے بلیک میل کرنے کے لئے کہیں اس کے اہل خاندان کو کوئی نقصان نہ پہنچا دے۔ اس طرح کے لوگ زچ ہو کر ایسے ہتھکنڈوں پر اتر آتے ہیں۔

اچانک شاہ میر کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اگر نادر شاہ نے ایسا کوئی عمل کیا تو میں تار پور میں قتل عام کر دوں گا، اس سے منسلک ایک ایک شخص کو ختم کر دوں گا۔ وہ لازمی طور پر پرانے کھنڈر آتا ہے۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو گا کہ اس کا دشمن اس کے اس ٹھکانے پر پہنچ چکا ہے۔

اب آخری کام یہی کرنا پڑے گا کہ اس پر ہاتھ ڈال دیا جائے، چاہے اس کے لئے کوئی ایکشن کرنا پڑے۔ حالانکہ اسے پتا تھا کہ وہ اسمگلروں اور قاتلوں کا ٹولہ ہے لیکن ابھی تک اس نے انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچایا تھا۔ وہ صرف دردانہ کے قاتلوں کو قانون کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔

نادر شاہ پرانے کھنڈر اپنی کار پر آتا تھا۔ وہ جب بھی وہاں آئے گا، اپنی کار پر ہی آئے گا اور اب اس کے علاوہ چارہ کار نہیں ہے کہ اس کی کار استعمال کی جائے۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔ یہاں آنے کے بعد پہلی بار اس نے اپنے سروس پستول کو چیک کیا اور وہاں سے چل پڑا۔

پہلی بار وہ دوسری سڑک سے بس پر بیٹھ کر واپس آیا تھا۔ بس نے اسے جہاں چھوڑا تھا، یہ وہی بس اڈہ تھا جہاں سے اس نے زمان شاہ کو بس میں بٹھایا تھا۔ دوبارہ وہیں پہنچ کر اس نے صورتحال کا جائزہ لیا۔ کچھ بسیں پھول گڑھی جا رہی تھیں۔ بالکل اتفاقیہ طور پر اسے وہی بس نظر آ گئی جس سے وہ پرانے کھنڈر سے یہاں تک آیا تھا۔ اس وقت اس پر جام پورہ کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ جام پورہ وہی جگہ ہو سکتی تھی جہاں سے بس آ رہی تھی۔ بس میں کافی سواریاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ خود بھی بس میں جا بیٹھا۔ کچھ دیر تک مسافروں کا جائزہ لیتا رہا۔

پھر ایک معصوم سی صورت والے مسافر سے پوچھا۔ ''یہ بس جام پورہ سے آگے نہیں جاتی۔''

''نہیں صاب۔۔۔۔۔ جام پورہ سے آگے تو مغل سرائے ہے، مغل سرائے کے لئے دوسری بس مل جائے گی۔''

''اچھا یہ بس جام پورہ سے تار پور تک آتی ہے۔''

''ہاں جی! اور یہاں سے جام پورہ جاتی ہے۔''

شاہ میر خاموش ہو گیا۔ اب وہ ذہن پر زور دے رہا تھا کہ کھنڈر سے تار پور آنے میں کتنا وقت لگے گا۔ نیز وہ کون سی نشانی ہے جس پر اترا جا سکتا ہے۔ بہت دیر تک وہ غور کرتا رہا۔ پھر بس چل پڑی۔

اس وقت وہ بہت بڑا خطرہ مول لے رہا تھا۔ اصل مسئلہ صحیح جگہ اترنے کا تھا۔ باہر کے مناظر تاریکی میں چھپے ہوئے تھے۔ بس اس نے اپنی پوری توجہ راستے پر مرکوز کر رکھی تھی۔ پھر جب اسے اندازہ ہوا کہ وہ جگہ آ گئی ہے تو اس نے بس ڈرائیور سے بس روکنے کو کہا۔

''خیر ہے صاب جی۔ کیا بات ہے؟'' ڈرائیور نے حیرت سے پوچھا۔

''مجھے یہیں اترنا ہے۔'' شاہ میر نے کہا۔

ڈرائیور نے رفتار سست کر دی۔ بس کے تقریباً تمام ہی مسافروں نے حیرت سے شاہ میر کو دیکھا۔ دلچسپ بات یہ ہوئی کہ جونہی شاہ میر نے نیچے قدم رکھے، بس ڈرائیور نے پوری رفتار سے بس بھگا دی۔ شاہ میر بے اختیار ہنس پڑا تھا۔ اس نے پستول ہاتھ میں لیا اور اللہ کا نام لے کر چل پڑا۔ اس کی ذہنی صلاحیتیں جاگ رہی تھیں۔ ایک ایک درخت، ایک ایک جھاڑی کو شناخت کرتا ہوا وہ آگے بڑھ رہا تھا۔ ایک جگہ اسے جھاڑیوں میں سرسراہٹ کا احساس ہوا اور وہ ٹھٹک کر رک گیا۔

اس نے بخوبی ان چمکتی آنکھوں کو دیکھا تھا جو اس سے زیادہ فاصلے پر نہیں تھیں۔ کوئی درندہ تھا۔ پتا نہیں اس نے شاہ میر پر حملہ کیوں نہیں کیا۔ کچھ لمحوں کے بعد وہ چلا گیا اور شاہ میر نے آگے قدم بڑھا دیئے۔ پھر اس نے کچھ فاصلے پر وہ بھوت محل دیکھ لیا اور اس کا چہرہ خوشی سے کھل اٹھا۔ اس کے اندازے بالکل ٹھیک تھے۔ البتہ اسے محتاط ہونا پڑا۔ بوسیدہ عمارت کے کچھ حصوں سے روشنی جھلک رہی تھی اور جنریٹر چلنے کی آواز آ رہی تھی۔

اس کا مطلب ہے کہ فیصلہ کن مرحلہ آ گیا ہے۔ نادر شاہ اس کے اندازے کے مطابق اندر موجود ہے۔ کچھ دیر کے بعد وہ پوری احتیاط کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ عمارت کے کچھ حصے روشن تھے لیکن سن گن لینے سے کوئی آواز نہیں سنائی دی تھی۔ وہ آگے بڑھا۔ اب وہ کوئی لائحہ عمل طے کر رہا تھا۔

پھر اسے نادر شاہ کی کار نظر آئی۔ ساتھ ہی ایک اور کار نظر آ رہی تھی جسے دیکھ کر شاہ میر ایک عجیب سی کیفیت کا شکار ہو گیا۔ یہ اس کی اپنی کار تھی تو یہ اب نادر شاہ کے قبضے میں ہے۔ اچھا کیا تو نے نادر شاہ، میں تجھے اسی کار میں لے جاؤں گا۔

پستول ہاتھ میں سنبھال کر وہ اندر داخل ہو گیا اور روشنی کی طرف بڑھنے لگا۔ جس کمرے میں تیز روشنی ہو رہی تھی، وہ اس کے دروازے پر رکا۔ اندر مکمل خاموشی تھی۔ کچھ دیر انتظار کے بعد وہ دروازے سے اندر داخل ہو گیا۔ وسیع کمرے کے عین درمیان کچھ لوگ لیٹے ہوئے تھے لیکن دوسرے لمحے شاہ میر کو احساس ہوا کہ وہ صرف لیٹے ہوئے نہیں ہیں۔ وہ تیز قدم اٹھا کر ان کے قریب پہنچ گیا اور پھر انہیں دیکھ کر ساکت رہ گیا۔ وہ سب مردہ تھے۔ ان میں ایک نادر شاہ تھا، دوسرا اس کا وہ ساتھی جو ہمیشہ اس کے ساتھ رہتا تھا، تیسرا بھی اس کا ساتھی تھا۔

شاہ میر سکتے کے عالم میں کھڑا تھا کہ اسے آہٹ محسوس ہوئی۔ وہ سانپ کی طرح پلٹا لیکن اسے ایک آواز سنائی دی۔ ''نہیں انسپکٹر صاحب! گولی مت چلانا، میں روشن خان ہوں۔''

روشن خان سامنے آ گیا۔ وہ دروازے کی سمت سے ہی اندر آیا تھا۔ شاہ میر کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ روشن خان کی لاش کی گمشدگی اس کے لئے مشکوک ضرور تھی لیکن اس کے بعد کہیں سے روشن خان کا کوئی نشان نہیں ملا تھا۔

''میں تمہارا انتظار کر رہا تھا انسپکٹر۔ مجھے معلوم تھا تم ضرور آؤ گے، وقت کے بارے میں نہیں جانتا تھا، کب آؤ گے۔''

''یہ لاشیں ہیں روشن خان؟'' شاہ میر نے کہا۔

''ہاں! یہ میرا شاہکار ہیں۔ ویسے تو اس پورے گروہ کو قتل کرنے کا خواہشمند تھا لیکن میرا اصل ٹارگٹ نادر شاہ ہی تھا اور میں نے اسے ختم کر دیا۔ چائے بنا کر لاؤں تمہارے لئے۔''

''نہیں روشن خان، آؤ بیٹھ کر باتیں کریں۔'' شاہ میر نے تھکے تھکے لہجے میں کہا اور دونوں ایک دوسرے کمرے میں آ بیٹھے۔

روشن خان نے کہا۔ ''میں بھی منشیات کے اسمگلروں کے اس گروہ میں شامل تھا لیکن میں ان سے زیادہ ذہین اور اعلیٰ کارکردگی کا حامل تھا، نادر شاہ مقامی طور پر اس گروہ کا سرغنہ تھا لیکن میں نے کبھی اس کی برتری نہیں قبول کی اور اسے نیچے دکھاتا رہا، یہاں تک کہ گروہ کے بین الاقوامی سربراہان نے ایک میٹنگ میں فیصلہ کیا کہ مجھے اس علاقے کا چیف بنا دیا جائے، یہ بات نادر شاہ کو سخت ناگوار گزری، میری بیوی مر چکی تھی، بس ایک بیٹا میری کائنات تھا، آکسفورڈ میں پڑھتا تھا۔ نادر شاہ نے اسے دھوکے سے بلا کر مجھے بلیک میل کیا۔ میں نے اس کی بات نہیں مانی تو اس نے میرے بیٹے کو قتل کر کے اس کی لاش میرے پاس بھجوا دی، بس۔''

بہت دیر تک روشن خان کی کہانی کا تاثر قائم رہا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ کافی دیر کے بعد وہ بولا ''میں نے اپنے بیٹے سے وعدہ کیا تھا کہ اس کی موت کے آنسو اس وقت بہاؤں گا جب اس کے قاتل کی لاش میرے قدموں میں پڑی ہو گی۔ آج میں پہلی بار رویا ہوں اسے یاد کر کے۔''

☆......☆......☆

شاہ میر تینوں لاشوں کو لے کر اچانک دارالحکومت پہنچا تھا۔ تھانے میں عملے کے دوسرے لوگ موجود تھے۔ اس نے صفورا اور زمان شاہ کو فون کیا اور دونوں شدید حیرانی کے عالم میں تھانے پہنچ گئے۔

روشن خان ان تینوں کے قتل کا اقبالی مجرم تھا، اسے لاک اپ کر دیا گیا۔ شاہ میر نے انچارج ہدایت اللہ سے پوری رپورٹ تیار کرائی اور پورے مواد کے ساتھ پولیس کے سب سے بڑے افسر سے ملا۔ افسر اعلیٰ یہ سارے ثبوت اور شاہ میر کی رپورٹ دیکھ کر دنگ رہ گئے تھے۔

لاشیں خاموشی سے سرد خانے میں رکھوا دی گئی تھیں۔ افسر اعلیٰ نے کس کس سے میٹنگ کی، اس میٹنگ میں کیا ہوا لیکن پھر شاہ میر کو خصوصی طور پر طلب کیا گیا اور افسر اعلیٰ نے کہا۔

''تمہاری اعلیٰ کارکردگی کا دل سے اعتراف ہے انسپکٹر۔ کچھ ایسی پرابلم ہیں جن کی بناء پر فیصلہ کیا گیا ہے کہ ان تمام واقعات کی خفیہ تحقیقات کی جائے، روشن خان کو ہماری تحویل میں دے دو، ہمیں اس کی مدد درکار ہے، اس کی حفاظت کا وعدہ کیا جاتا ہے، وہ تینوں لاشیں لاوارث قرار دے کر دفن کر دی جائیں گی۔''

''اور وہ مظلوم گھرانہ سر۔ جس کی گردن اس لئے جھکی ہوئی ہے کہ لوگ اسے ایک بدکردار لڑکی کا گھرانہ سمجھتے ہیں اور وہ مظلوم مقتولہ۔'' شاہ میر کی پھنکار ابھری۔

''مجبوری ہے انسپکٹر شاہ۔ ہم اس کیس کو اعلیٰ پیمانے پر شروع کریں گے تو کچھ غیر متعلقہ افراد کی گرفتاریاں ہوں گی، کچھ افسروں کے تبادلے ہوں گے اور بس۔۔۔۔۔ ہاں ایک وعدہ میں تم سے کرتا ہوں۔ دردانہ کے دونوں بھائیوں کو بہتر نوکریاں میں دلواؤں گا اور ان لوگوں کو بہت معقول معاوضہ دے کر کسی دوسرے علاقے میں رہائش دلوائی جائے گی۔'' افسر اعلیٰ نے کہا۔

(ختم شد)

KitaabPoint.blogspot.com